R. No. 2186/57 Regd. No. L. 972.

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Date 1-8-15-22

Phone—29
Annual Rs. 4/-
Per Copy -/12 P

جلد ۲۵ - شمارہ ۴۷ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۱۵ر دسمبر ۱۹۶۶ء

اداریہ

تعلیمی کمیشن اور ذریعۂ تعلیم

حال ہی میں اس تعلیمی کمیشن کی رپورٹ شائع ہوئی ہے جس کے صدر ڈاکٹر کوٹھاری تھے۔ اس کمیشن نے پہلی دفعہ ہندوستان کے تعلیم کے مسئلے کا ایک جامع حل پیش کیا ہے اور ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم تینوں منزلوں کے لیے مناسب سفارشات کی ہیں۔ کمیشن نے ذریعۂ تعلیم کے متعلق جو رائے ظاہر کی ہے وہ اتنی اہم ہے کہ ہم آج کی صحبت میں اس کا تذکرہ ضروری سمجھتے ہیں۔

قومی یک جہتی اور تعلیم کے رشتے پر روشنی ڈالتے ہوئے کمیشن نے ایک مناسب لسانی پالیسی اور جدید ہندوستانی زبانوں کی ترقی کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ کمیشن کا خیال ہے کہ جدید ہندوستانی زبانیں اسی وقت ترقی کر سکتی ہیں جب انھیں ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی منزل پر ہی نہیں، اعلیٰ تعلیم کی منزل پر بھی ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔ کمیشن نے ٹیگور کے ایک خطبے کا حوالہ دیا ہے جو انھوں نے تیس سال پہلے کلکتہ یونیورسٹی کے کانووکیشن کے موقع پر دیا تھا اور جس میں جاپان کی مثال پیش کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ ذہن کی کشادگی اور علم کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ مادری زبان کو اعلیٰ سطح تک ذریعۂ تعلیم بنایا جائے۔ کمیشن نے درست کہا ہے کہ غیر ملکی زبان میں تعلیم حاصل کرنے کے معنی یہ ہیں کہ طلبہ مضمون پر حاوی ہونے کے بجائے طوطے کی طرح رٹنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ تعلیمی نقطۂ نظر سے بھی یہ بہتر ہے کہ جس زبان میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم ہو اسی کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنایا جائے۔ ۱۹۳۷ء سے پہلے بہرحال انگریزی اسکولوں کے اوپر کے درجوں اور کالجوں میں ذریعۂ تعلیم تھی اور اس وجہ سے طلبہ کو الجھن نہ ہوتی تھی۔ اب جبکہ ثانوی منزل تک تعلیم مادری یا علاقائی زبانوں میں دی جا رہی ہے کوئی وجہ نہیں کہ اعلیٰ تعلیم کی منزل پر ایک غیر ملکی زبان کو بدستور ذریعۂ تعلیم رکھا جائے۔ قومی یک جہتی کی رو سے بھی یہ اقدام مفید ہوگا کیونکہ اس طرح اعلیٰ تعلیم یافتہ اشخاص اور عوام کے درمیان خلیج کم ہوگی۔ کمیشن نے اس سلسلے میں حسب ذیل سفارشات کی ہیں:۔

(۱) چونکہ علاقائی زبانوں کی ترقی، ملک کی عام ترقی کے لیے اور تعلیم کے معیار کو مجموعی طور پر بہتر بنانے کے لیے ضروری ہے اور چونکہ علاقائی زبانوں میں ہی طلبہ کی تخلیقی صلاحیت اُجاگر ہو سکتی ہے اس لیے علاقائی زبانوں کو تعلیم کی ہر منزل پر ذریعہ تعلیم ہونا چاہیے۔

(۲) اس مسئلے کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے علاقائی زبانوں کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے لیے اقدامات میں دیر نہیں کرنا چاہیے اور دس سال کے اندر یہ کام ہو جانا چاہیے ورنہ مسئلہ اور پیچیدہ ہو جائے گا۔ اس کے لیے ہندوستانی زبانوں میں مناسب ادب پیدا کرنے کے لیے اور اساتذہ کو تربیت دینے کے کاموں کے لیے ایک نیا پروگرام جلد سے جلد بنانا پڑے گا۔

(۳) اس معاملے میں حالات کو دیکھتے رہنے اور کچھوے کی طرح پیچھے رہنے سے کام نہ چلے گا بلکہ جرأت سے کام لے کر ایک واضح پالیسی اور پروگرام وضع کرنا پڑے گا۔

(۴) عبوری دور کے لیے مناسب تحفظات کرنے پڑیں گے تاکہ تعلیم کے معیار پر برا اثر نہ پڑے۔

(۵) اس کے علاوہ کچھ آل انڈیا اداروں میں انگریزی کی جگہ ہندی بھی لے سکتی ہے بشرطیکہ ہندی مناسب ترقی کر لے اور غیر ہندی علاقوں کے طلبہ کی دقتوں کو لحاظ رکھا جائے۔

کمیشن نے خاص طور پر اس کا ذکر کیا ہے کہ اگرچہ اردو موجودہ وقت میں کسی علاقے کی زبان تسلیم نہیں کی گئی ہے مگر چونکہ وہ کئی ریاستوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور ایک کل ہند زبان ہے اس لیے اس کی ترقی کے لیے تمام ضروری اقدامات ہونے چاہییں اور اسے بھی ہر منزل پر ذریعۂ تعلیم بنانا چاہیے۔

کمیشن نے یہ بھی سفارش کی ہے کہ اعلیٰ تعلیم کی منزل پر انگریزی اس لیے ضرور سکھائی جانی چاہیے کہ اس کے ذریعے سے عالمی معیاروں سے آشنا ہونا ممکن ہے اور اسے کتب خانے کی زبان کے طور پر سکھانا یقیناً مفید ہوگا۔

کمیشن نے اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ کچھ ایسے کالجوں کے چلانے کے لیے حکومت کو امداد ضرور دینی چاہیے جو اردو کے ذریعے سے اعلیٰ تعلیم دے سکیں۔ اس طرح لسانی اقلیتوں کو ترقی کے [illegible]

ترقی کرنے کا موقع ملے گا۔

غرض پہلی دفعہ صاف اور واضح طور پر ماہرینِ تعلیم نے علاقائی اور مادری زبانوں کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنانے پر اصرار کیا ہے۔ اب جو لوگ کسی ایک خاص اقلیت کے حقوق کی حفاظت کے لیے انگریزی کو عرصہ دراز تک باقی رکھنا چاہتے ہیں، یا جو ایک سطحی اور سستی سیاسی وحدت کی خاطر ہندی کو انگریزی کی جگہ دینا چاہتے ہیں یا جو مشکلات اور معیار کا نام لے کر اس مسئلے کو ٹالنا چاہتے ہیں انھیں اپنی رائے پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ تعلیم جو انسانیت کی قدریں دیتی ہے، تہذیب کی جو روشنی عطا کرتی ہے، علم کی جو لگن پیدا کرتی ہے، سماج کو، فطرت کو اور حق کو بہتر طور پر سمجھنے کی جو صلاحیت پیدا کرتی ہے، وہ علاقائی یا مادری زبانوں کے ذریعہ سے ہی ساری قوم میں عام ہو سکتی ہے۔ اس لیے اب اعلیٰ تعلیم کے لیے علاقائی یا مادری زبانوں میں تصنیف و تالیف و تراجم کا ایک بڑا پروگرام فوراً شروع کر دینا چاہیے تاکہ دس سال کے اندر سب علاقائی اور مادری زبانوں کے ذریعہ سے اعلیٰ تعلیم دی جانے لگے۔ دوسری زبانوں کے لیے ریاستیں خود بہت کچھ کریں گی، اگر مرکز کو اردو کے لیے وسائل مہیا کرنے ہوں گے تاکہ اردو بھی ترقی کر سکے اور اردو بولنے والی آبادی اپنی شخصیت کی تکمیل کے ذریعہ سے قومی زندگی میں بھی بھرپور حصہ لے سکے۔ امید ہے کہ بھارتی جنتا کمیٹی جو مرکزی وزارت تعلیم نے حال ہی میں بنائی ہے تعلیمی کمیشن کی سفارشات کی روشنی میں اردو کی علمی ترقی کے لیے جلد سے جلد مناسب اقدامات کرے گی اور ضروری وسائل مہیا کرے گی۔ اس سلسلے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کو بھی اپنی روایات، تاریخ اور نصب العین کی روشنی میں مناسب پروگرام بنانے ہوں گے

بی۔بی۔سی کی اردو سروس

تعمیری مراسلے لکھنے والوں کو انعام دیے جائیں گے

بی۔بی۔سی کی اردو سروس کو دنیا بھر سے خطوط موصول ہوتے ہیں سامعین کے یہ خطوط پروگرام مرتب کرنے والوں کے لیے بہت مفید ہیں۔ پروگرام پر تعمیری تنقید کی حوصلہ افزائی کے لیے مراسلہ نگاروں کو کتابوں کا انعام دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

یہ انعام ہر تین ماہ کے بعد ایک ایسے مراسلہ نگار کو دیا جائے گا جو اس عرصہ میں سب سے دلچسپ مراسلہ بھیجے گا۔ انعام دیتے وقت موجودہ پروگراموں پر تنقید اور نئے پروگراموں کے لیے صحت مند مشوروں کو مدِ نظر رکھا جائے گا۔

مراسلے مندرجۂ ذیل پتہ پر بھیجے جائیں:-

بی۔بی۔سی اردو سروس۔ پی۔ او۔ باکس نمبر ۱۰۹۔ دہلی

(دعوت، دہلی)

مختصر افسانوں کا مقابلہ

لندن۔ معلوم ہوا ہے کہ بی۔بی۔سی کے مختصر افسانوں کے مقابلے کے لیے ۱۰۰ ملکوں کے افسانہ نگاروں نے اپنی دو ہزار کہانیاں بھیجی ہیں۔ ہندستان سے تقریباً دو سو کہانیاں موصول ہوئی ہیں اور وہ ان ملکوں میں سے ہے جہاں سے سب سے زیادہ کہانیاں موصول ہوئی ہیں۔ اس مقابلہ کی آخری تاریخ ۳۱ر اکتوبر تھی۔

مس کے فاریلنے جو بعض دیگر اشخاص کے ہمراہ جج کے فرائض انجام دیں گی اپنے ایک بیان میں کہا ہے کہ کہانیوں کی اتنی بڑی تعداد دیکھ کر ہمیں بہت خوشی ہوئی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ دنیا افسانہ نویسوں سے بھری پڑی ہے۔ بہت سے لوگوں نے تو ایک ایسی زبان میں کہانیاں لکھی ہیں جو ان کی ثانوی زبان ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ انگریزی زبان دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہے۔ (سنگم، پٹنہ)

برہان پور سے ماہنامہ "شجر" کا اجرا

تقریباً ۲۴ سال بعد دار السرور برہان پور سے ایک علمی و ادبی ماہنامہ کا اجرا ہو رہا ہے جسے جناب انور حسین اثر، شاہد انصاری اقبال حسین ایم۔ اے ایڈیٹ کریں گے۔ پہلا شمارہ دسمبر ۶۶ء میں منظر عام پر آ رہا ہے۔ اہل ذوق حضرات ماہنامہ "شجر" کے ساتھ پورا پورا تعاون فرمائیں گے۔ (مدیر اعزازی اقبال نقیب)

جے پور (راجستھان) میں اردو ریڈنگ روم کا اجرا

جے پور۔ انجمن ترقی اردو راجستھان جے پور نے "سوائی جے سنگھ اردو ریڈنگ روم" نامی ایک عالی شان عمارت تعمیر کرائی ہے جو انجمن مذکور ہی کی ملک ہے اور اسی کے زیر اہتمام رہے گی۔ اس کا مقصد اس کے نام سے ظاہر ہے۔ وجہ تسمیہ یہ ہے کہ شہر جے پور کے بانی مہاراجہ سوائی جے سنگھ کے نام پر ایک امدادی فنڈ الموسوم بہ "مہاراجہ سوائی جے سنگھ بینی وولینٹ فنڈ"

(MAHARJA SIWAI JAI SINGH BENEVOLENT FUND)

قائم ہے جس سے اس تعمیر کے لیے معتد بہ عطیہ دیا گیا ہے۔ اور اس کا سنگ بنیاد گایتری دیوی صاحبہ ایم۔ پی جے پور نے رکھا ہے۔

یہ عمارت موتی ڈونگری روڈ بیرون سانگانیر دروازہ پر واقع ہے جو راجستھان یونیورسٹی سے دور نہیں، جے پور کے خاص خاص کالجوں اور اسکولوں سے، جے پور کے مشہور باغ "رام نواس" سے بھی قریب ہے۔ یہ ریڈنگ روم انھیں لوگوں کے لیے نہیں ہے جن کی مادری زبان یا پسندیدہ زبان اردو ہے بلکہ ہر اس شخص کے لیے جو مطالعہ کا شائق ہو۔ اسی لیے اس میں اردو کے علاوہ دوسری زبانوں کے بھی اخبار و رسائل اور کتابوں کا انتظام کیا گیا ہے۔

۱۴ر نومبر یوم پیدائش پنڈت جواہر لال نہرو سے اس کا اجرا ہو گیا ہے اور قارئین کی کثرت سے آمد و رفت شروع ہو گئی ہے۔

(نامہ نگار)

ڈاکٹر رفیق حسین

سید محمود کی دو نظمیں

(تہذیب الاخلاق میں)

عظمت کی نوعیت کیسی ہی کچھ ہو ایک نہ ایک دن ظاہر ہو کر رہتی ہے۔ اگر وہ واقعی عظمت ہے۔ بعض قومی رہنما اپنی خدمتوں کی بنا پر بہت جلد اپنی زندگی ہی میں محبوب و مقبول ہو جاتے ہیں اور بعضوں کی صلاحیتوں پر ہلکا یا دبیز پردہ پڑے رہنے کی وجہ سے ان کی عظمت کا احساس و اعتراف ذرا دیر میں ہوتا ہے۔

سر سید اپنی زندگی ہی میں محبوب و مقبول ہو گئے اور جیسے جیسے زمانہ گزرتا جائے گا ویسے ویسے ان کی معرفت اور زیادہ بڑھتی جائے گی۔ یہی بڑائی کی کسوٹی ہے۔

ان کے چھوٹے صاحبزادے جسٹس سید محمد محمود بھی بعض اوصاف کی بنا پر شریف و عظیم تھے لیکن ان کی عظمت کا احساس ذرا دیر میں ہوا لیکن ہوا ضرور۔ انگریزوں نے ان کی علمی لیاقت اور آئینی صلاحیت کو مد نظر رکھتے ہوئے انھیں الہ آباد ہائی کورٹ کا جج مقرر کیا تھا۔ وہ پہلے ہندوستانی تھے جو اس عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوئے تھے۔ ان کی تقرری اس لیے نہیں ہوئی تھی کہ وہ سر سید کے صاحبزادے تھے خاندانی برتری کی وجہ سے اگر وہ جج ہوتے ہوتے تو شاید ایک دن بھی عدلیہ کے اہم فرائض انجام نہ دے سکتے۔ ہائی کورٹ کی ججی کے فرائض و خدمات کی انجام دہی اور ان کی اولیت و اشرفیت کے اعتراف میں الہ آباد ہائی کورٹ کے صد سالہ جشن کی تقریب کے موقع پر ان کے انتقال کے بہت دنوں بعد ان کی تصویر کی رسم نقاب کشائی ۲۵ نومبر ۱۹۶۶ء کو ادا کی جا رہی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ اعزاز ان کی عظمت کی دلیل ہے۔ مگر اس نقاب کشائی کی اہمیت صرف علامتی ہے۔ مرحوم کے ہزاروں فیصلے (جو ساری عدالتوں کے روز بروز بطور نظیر پیش ہوتے رہتے ہیں) ان کے ذہن رسا سے نکلے ہوئے سیکڑوں لطیفے (جو دوستوں کو خوش کرتے رہتے ہیں) غیر ملکی افسروں سے ان کی نوک جھونک کے متعدد واقعے اور قوم پرستی کے بہت سے قصے (جو ہم آئے دن سنتے رہتے ہیں) پیچ معنوں میں ان کی عظمت و محبوبیت کے بین شواہد ہیں۔ یہ سب الہ آباد اور علی گڑھ کے روشن خیال باشندوں کو حفظ ہیں اور بڑے فخر و اعزاز سے صرف زبانی دہرائے جاتے ہیں۔ کتنا اچھا ہوتا اگر انھیں مجتمع کر دیا جاتا۔ وہ صرف ہائی کورٹ کے جج ہی نہیں تھے۔ ایک لائق باپ کے لائق بیٹے تھے جس کے دل میں قومی ترقی و اتحاد کی سچی لگن تھی۔ وہ ایک اچھے ادیب، مدبر بھی تھے جس کی صلاحیتوں پر ابھی تک پردہ پڑا ہوا ہے۔ وہ غیر معمولی طور پر ذہین تھے۔ ان کی شخصیت و کردار کے بہت سے پہلو ابھی عام نگاہوں کے سامنے نہیں ہیں۔ ان کی تصنیفات کی صحیح تعداد و منزلت کی تشخیص ابھی تک نہیں ہوئی ہے۔ ان سب کی چھان بین کی ضرورت ہے۔ فی الحال ہماری معلومات بہت تھوڑی اور ناکافی ہیں۔ تہذیب الاخلاق کی چوتھی جلد کے صفحہ ۲۰ پر اختصار کے ساتھ مولوی مشتاق حسین کا تحریر کردہ مختصر نوٹ ہے جس سے ان کی علمیت کا کسی قدر احساس ہوتا ہے۔ اس نوٹ کے ابتدائی جملے حسب ذیل ہیں۔

"سید محمد محمود صاحب، سید احمد خاں صاحب بہادر سی، ایس، آئی کے چھوٹے صاحبزادے کا سالانہ امتحان کریسٹ کالج یونیورسٹی لندن میں بڑی کامیابی کے ساتھ ہوا۔ عام امتحان میں جو تمام علوم میں ہوا ان کا نمبر دوسرا رہا اور خاص انگریزی زبان دانی میں تمام کالج میں صرف ایک اور طالب علم ایسا لائق نکلا کہ اس کے جواب اور سید محمود صاحب کے جواب برابر وقعت کے تھے۔ اسی لیے دونوں کا نام اول نمبر میں لکھا گیا۔ باقی تمام طالب علموں سے سید محمد محمود خاص ان کی ملکی زبان میں لائق رہے ہے

"بریں مژدہ گر جاں فشانم رواست"

(تہذیب الاخلاق جلد چہارم صفحہ ۲۰ لاہور ایڈیشن)

تہذیب الاخلاق، علی گڑھ میگزین، اولڈ بوائز، کالج میگزین اور دوسرے اہم رسالوں میں ان کی زندگی کے بہت سے واقعات مل جائیں گے۔ سید محمود کی پیدائش، تعلیم و تربیت، جوالا گری ملازمت اور اس سے استعفا، علی گڑھ کالج کی ماہوار خدمتیں اور اس سے علیحدگی اور اسی طرح کے بے شمار واقعات سے ان کی حیات و کردار کا تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔ تہذیب الاخلاق کے منتخب مضامین کی چوتھی جلد میں سید محمود کے صرف تین مضمون ہیں۔

۱۔ شہادت الف ۲۔ دوستی کا برتاؤ ۳۔ ہماری یونیورسٹی کی ضرورت۔ اولڈ ایڈیشن کی چھان بین کی جائے تو صحیح طور پر اندازہ ہو سکے گا کہ ان کے مضامین کی مجموعی تعداد کتنی ہے۔ ان تین مضامین کے علاوہ بھی معلومات فراہم ہو سکتی ہیں۔ میں نے تہذیب الاخلاق (نیو سیریز) کا مطالعہ صرف تھوڑی دیر کے لیے کیا تھا۔ مجھے سید محمود کا ترجمہ کیا ہوا ایک ناول اور دو نظمیں مل گئیں۔ مجھے یہ کچھ دستیاب ہوئیں ان کا اظہار ضروری ہے۔

علی گڑھ میں میرا قیام گزشتہ جولائی میں کئی دن رہا۔ پروفیسر آل احمد سرور اور دوسرے اساتذہ و طلبائے مسلم یونیورسٹی کی سنٹرل لائبریری (جو اب مولانا آزاد لائبریری کے نام سے موسوم ہے) کے اردو سیکشن کی تعریف کی۔ مجھے اس کے دیکھنے کا اشتیاق ہوا۔ مصروفیت کے باوجود تھوڑا سا وقت نکال کر میں اسے دیکھنے گیا۔ اور جیسی تعریف اس کی سنی تھی اس سے کہیں اچھی حالت میں اسے میں نے پایا۔ لائبریری کے عمال نے مجھے خوشی سے مطالعہ کرنے کی فوراً اجازت دے دی۔ میں نے تہذیب الاخلاق کے اصل شماروں کو دیکھنا چاہا۔ اس لیے کہ اردو ادب کو یہی علی گڑھ کا خاص عطیہ ہے۔ اردو سیکشن کے مہتمم نے بہت سی جلدیں متعلقہ الماری سے نکال کر میری میز پر رکھ دیں۔ ان جلدوں میں نئی اور پرانی دونوں سیریز کے شمارے تھے۔ بس اسے حسن اتفاق ہی کہیے کہ میں نے جو سیریز کی ایک جلد اٹھائی وہ نیو سیریز کی پہلی جلد تھی۔ فہرست کو دیکھا تو میری نظر "عاصرہ خرناطہ" پر پڑی۔ اس کے لکھنے والے سید محمود تھے۔ تہذیب الاخلاق میں ناول کی اشاعت مجھے غیر معمولی معلوم ہوئی۔ اسے میں نے پڑھنا شروع کیا۔ اس کی دوسری قسط میں مجھے ایک نظم ملی جسے آپ گیت کہہ سکتے ہیں۔ پانچویں قسط میں ایک اور نظم ملی۔ اس وقت میں نے یہی مناسب سمجھا کہ انھیں نوٹ کر لوں۔ نظمیں ابھی خاص نہیں اور

لے تہذیب الاخلاق (لاہور ایڈیشن) جلد چہارم صفحہ ۲۰

لے 〃 〃 〃 صفحہ

لے 〃 〃 〃 صفحہ

اپنے دور کے لحاظ سے منفرد تھیں۔

"محاصرہ غرناطہ" لارڈ بلور لٹن کے ناول لیلیٰ کا ترجمہ ہے۔ عمومی حیثیت سے یہ ناول اسپین سے متعلق ہے لیکن اسے غرناطہ کے مسلمانوں کی معاشرت کا خصوصی مطالعہ سمجھنا چاہیے۔ اسی بنا پر سید محمود نے ترجمہ کیے ہوئے ناول کا نام "محاصرہ غرناطہ" رکھا۔ موصوف نے ابتدا ہی میں اس ناول کی نوعیت اور ترجمہ کی مقصدیت واضح کردی ہے۔ اس ابتدائیہ کا مفید مطلب حصہ حسب ذیل ہے:

"جو ناول کہ لارڈ بلور لٹن نے تحریر فرمایا ہے اسی سے اسپین اور علی الخصوص غرناطہ کے مسلمانوں کا حال بخوبی عیاں ہوتا ہے اور انھوں نے رنگین واقعات کو بطریق قصہ اس خوبی عبارت سے بیان کیا ہے کہ گویا اس زمانے کے مسلمانوں کے پولیٹیکل اور سوشل حالات کی تصویر کھینچی ہے کہ جس سے ان کی علمی اور تمدنی اور اخلاقی حالت آنکھ کے سامنے گزر جاتی ہے۔ اس ناول کو میں نے ایسا سمجھا کہ اس کے پڑھنے سے ہماری قوم مسلمانان ہند کو فائدہ ہوگا بلکہ ایسی دلچسپی ہوگی کہ اس سے ان کو عبرت ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے۔ بعض میرے ذی وقعت احباب نے جن کے علم اور لیاقت کے معاملات تعلیمی کی نہایت قدر ہے انھوں نے یہ رائے دی کہ میں اس اپنے ترجمے کو تہذیب الاخلاق میں قسطاً قسطاً چھپوا دوں کہ اس سے دو فائدے مترتب ہیں۔ اول تو یہ کہ اسپین کے مسلمانوں کے آخری حالات تاریخی دلچسپی کے ساتھ معلوم ہوں گے اور دوسرے یہ کہ جو لوگ اردو لٹریچر کو ترقی دینا چاہتے ہیں اور زبان انگریزی نہیں جانتے ان کو اس مختصر ناول کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ انگریزی میں ناول لکھنے کا طرز اور انداز کیا ہے۔ جو ترجمہ کہ میں نے کیا ہے وہ حتی الوسع اس قدر لفظی ہے کہ جو شخص اصل انگریزی کتاب کو پڑھنا چاہے اس کو بھی اس ترجمے سے مدد ملے گی۔ اردو کے محاورے کی رعایت رکھی گئی ہے۔ مگر اس امر پر زیادہ توجہ کی گئی ہے کہ جو طرز ادا کہ مصنف لارڈ بلور لٹن نے خود اختیار کیا ہے اور جو استعارات وہ خوبی عبارت کے لیے کام میں لائے ہیں ان میں تغیر و تبدل نہ کیا جائے کیونکہ ایسی تبدیلی کرنے سے کیفیت ترجمہ باقی نہیں رہتی۔"

(تہذیب الاخلاق، نیو سیریز جلد ۲ نمبر ۱، نیو سیریز بابت یکم شوال ۱۳۱۳ھ
اور ۲۴-۳-۱۳ نبوی)

یہ ناول تہذیب الاخلاق کی نیو سیریز میں بالاقساط شائع ہوا۔ پہلی قسط کی اشاعت یکم شوال (۱۳۱۳ھ = ۲۴-۳-۱۳ نبوی) جلد ۲ نمبر ۱ نیو سیریز میں ہوئی۔ بعض نمبروں میں کوئی قسط شائع نہیں ہوئی۔ پانچویں قسط یکم ربیع الثانی ۱۳۱۴ھ میں ہوئی۔ باقی اقساط میں نہیں دیکھ سکا۔ میں نے یکم رمضان ۱۳۱۴ھ تک کے شمارے دیکھے۔ آئندہ جب علی گڑھ جاؤں گا تو انھیں بھی دیکھوں گا۔ محاصرہ غرناطہ کے باب اول فصل (۲) میں یہ نظم درج ہے جسے فی الحال ترجمہ ہی کہنا چاہیے:

ایمنا کا گیت

۱۔ اے نغمہ نرم و خوش ادا چل
اے نقرئی موج جاں فزا چل
اے باد صبا تو اپنے ہمراہ
گل برگ سرود و نغمہ لے جا
یہ کشتی نازک و معطر
لے جا تو اسے بجان دلبر
لے جا تو اسے نسیم لے جا

۲۔ ہم پر ہے کھلی بہار ایسی
جوں شاخ درخت باغ رضواں
جن پر کہ ہیں گل نکھر کے لٹکے
اور ہل کے ہوا سے ہیں وہ جھکتے
ہم پھرتے ہیں جبکہ رقص کرتے
نغمے کے ہیں ہم سے غنچے جھڑتے
جنت ہے وہیں جہاں ہو جانا

۳۔ اے میٹھی صدا جسے ہوں سنتی
اے کاش کہ مجھ میں بھی ہوتی
اور تیری طرح میں اس کو بھاتی
تو دل ہی میں اس کے بیٹھ جاتی
جب ہوتے خیال تازہ اس کے
میں دل ہی میں رہتی اس کے بس کے
اس طرح اخیر ہوں تو بہتر

تہذیب الاخلاق باب (۱) فصل ۲

"محاصرۂ غرناطہ" کی پانچویں قسط میں یہ نظم ہے۔

ترانۂ شب

اے جان کی روشنی اب جلدی سے ہو خراماں
ہم جولیوں کو اپنے گردوں پہ کر پشیماں
وہ پیاری پیاری آنکھیں مشتاق ان کی ہے جاں
شب بھی بغیر ان کے ہے غم زدہ و حیراں
ہے آیت مقدس خنجر پہ میرے کندہ
صفحہ پہ دل کے لیکن ہے نام تیرا لکھا
ہیں نور دین و ایماں دونوں کے لفظ یکساں
دونوں کا پیچ برابر دونوں ہیں پاک یکساں
ہیں دونوں گو کہ یکساں گو پاک ہیں برابر
سچا ہے دل زیادہ تلوار سے بھی بڑھ کر
اے جان کی روشنی آ، ہر مجھ پہ جلوہ فرما

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

سانحہ

رحمٰن جامی

آنکھ کو نور ملا
نور سے اک طور جلا
اور پھر پھیل گئی حسن کی اک شوخ ضیاء
اور پھر کتنے ہی جلووں سے منور ہوا دل
اور پھر دل نے محبت کے ترانے گائے
جانے پھر کیا ہوا
اک حادثہ
تیرہ ہے جہانِ دل بے خروش

درد گیتوں میں.....

خلیق تنویر

شام گھٹاؤں کی سرمئی زلفیں
راکھ بن کر فضا میں چھائی ہیں
رات کے غم سے چہرے پر
چاندنی مل رہی ہے اپنا لہو
وقت کے تیز گام پر دل میں
یاد ماضی کے خار چبھتے ہیں
ذہن میں کھل گئی ہے فکر جمیل
سانس کی آنچ تیکھی ہوئی ہے
دل میں جذبات کا مچل رہا
درد گیتوں میں ڈھل رہا ہے کہیں!

اندھیرے

مشتاق احمد خاں عادل اوجینی

دائمی یہ اندھیرے گھٹا سا سماں
کس طرح ختم ہوں کوئی صورت نہیں
آرزوئیں مری اور مرے خواب کو
ان اندھیروں کی بے رحم سی چوٹ نے ریزہ ریزہ کیا
دل میں آہوں کے طوفان اٹھتے رہے
پھر بہاریں خزاں میں بدل گئیں
میری کشتِ تمنا ہری کب ہوئی؟
پھر بھی خاموش ہی الجھنوں سے بھرا جام پیتا رہا
صبر کے گہرے غاروں کے ظلمات میں
تھامے امید کی ڈور بڑھتا رہا
زندگی اپنی یوں ہی گزرتی رہی
یہ اندھیرے کبھی ختم ہوتے نہیں

اردو کا مسئلہ اور آچاریہ ونوبھاوے کے مشورے

ہندی کے بدنام اردو دشمن ہفتہ وار "دھرم یگ" نے حال ہی میں آچاریہ ونوبھاوے کی ایک تقریر کا کاٹی چھاپا ہے جس میں انھوں نے اردو والوں کو کچھ مشورے دیے ہیں۔

آچاریہ بھاوے نے اس تقریر میں جو کچھ کہا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان میں اردو بولنے والوں کی کوئی ایسی ریاست نہیں جہاں اردو بولنے والوں کی اکثریت ہو۔ ریاستی زبان کے طور پر ہندی اور اردو دونوں کا ایک ریاست میں چلنا موجودہ آئین کے مطابق ممکن نہیں، موجودہ آئین کے تحت اردو کو علاقائی زبان کے طور پر تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ اردو کو علاقائی زبان مان لینے سے حکومت پر مزید اخراجات کا بوجھ پڑے گا۔ اردو کو قائم رکھنے کے لیے اردو کو دیوناگری میں لکھنا شروع کر دیا جانا چاہیے۔

"دھرم یگ" نے آچاریہ ونوبھاوے کی تقریر اور مشورے غالباً اس خیال سے شائع کیے ہیں کہ اس سے اردو کا کیس کمزور ہو جائے گا لیکن حقیقت یہ ہے کہ خود آچاریہ ونوبھاوے نے جو دلائل دیے ہیں ان کی بنیادیں نہایت کمزور ہیں۔ یہ بات بالکل درست ہے کہ ملک کی کسی بھی ریاست میں اردو بولنے والوں کی اکثریت نہیں مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ملک کی کئی ریاستوں میں اردو بولنے والوں کی کافی بڑی آبادی ہے اور اسی لیے وہ اپنی زبان کو ان ریاستوں میں سرکاری زبان نہیں بلکہ دوسری علاقائی زبان قرار دینے کی مانگ کر رہے ہیں اور موجودہ آئین کے مطابق اس کی پوری گنجائش موجود ہے۔ دستور کی دفعہ ۳۴۵ کے ذریعہ جہاں ہندی کو سرکاری زبان قرار دیا گیا ہے وہیں ریاستوں کی اسمبلیوں کو بھی یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ قانون کے ذریعے اس ریاست کی کسی بھی زبان کو سرکاری مقاصد کے لیے استعمال کر سکتی ہیں۔ دستور کی دفعہ ۳۴۷ کے تحت صدر جمہوریہ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ اگر ان سے مطالبہ کیا جائے اور انھیں اطمینان ہو جائے کہ کسی ریاست میں کسی زبان کے بولنے والوں کی کافی تعداد اپنی زبان کو سرکاری زبان تسلیم کرانے کی خواہش رکھتی ہے تو وہ اس بارے میں حکم جاری کر سکتے ہیں۔ اردو والوں کی مانگ بالکل یہی ہے کہ صدر جمہوریہ اپنے اسی اختیار سے کام لیتے ہوئے اتر پردیش، مدھیہ پردیش، بہار، دہلی اور راجستھان اور دوسری ریاستوں میں اردو کو دوسری علاقائی زبان قرار دیں۔

جہاں تک اردو کے لیے دیوناگری رسم الخط اختیار کرنے کا مشورہ ہے، ایک پرانی تجویز ہے اور اس پر کافی بحث بھی ہو چکی ہے۔ ہندی کے ایسے انتہا پسند حامیوں کی کمی نہیں جو اردو کو ہندی کا ایک روپ قرار دے کر دیوناگری رسم الخط کو اس پر مسلط کر دینا چاہتے ہیں۔ آچاریہ ونوبھاوے یقیناً ایسے لوگوں میں شامل کروانا تو نہیں چاہتے ہوں گے۔ زبان اور رسم الخط کا تعلق اتنا گہرا ہوتا ہے کہ رسم الخط کی تبدیلی کسی زبان کو ختم بھی کر سکتی ہے ایسی صورت میں کسی زبان کا رسم الخط بدل دینے کا مشورہ کسی طرح سے بھی اردو والوں کے لیے نہ مناسب ہے اور نہ مفید۔

رہا "دھرم یگ" جیسے اردو دشمن رسالوں کا معاملہ تو وہ اردو کے کیس کو کمزور کرنے کی چاہے جتنی بھی کوشش کریں اس میں انھیں کامیابی نہیں ہو سکتی اور اردو والے اپنی زبان کا جائز جمہوری حق حاصل کر کے رہیں گے۔

یعقوب بدایونی

ایک گمنام شاعر..... جناب وحشی شاہجہاں پوری

معترضین کی روش اب تک کچھ اس انداز کی رہی ہے کہ وہ سب سے پہلے شاعر کے حسب و نسب کو بڑے شاندار الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔ اس کے بعد شعری رموز و نکات پر خامہ فرسائی کی جاتی ہے۔ جہاں تک جناب وحشی شاہجہاں پوری کے حسب و نسب کا تعلق ہے نہ مجھے اس کا علم ہے اور نہ میں اسے ضروری سمجھتا ہوں۔ اس لیے کہ چمنستانِ شاہجہاں پور کے وہ ایک ایسے شگفتہ پھول ہیں جس کے حسنِ دلفریب کو دیکھ کر جب انسان اتنا مسحور ہو جائے کہ اسے اپنا بھی ہوش نہ رہے تو پھر اس کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ وہ دریافت کرے کہ یہ پھول گلاب کا ہے یا چنبیلی کا، سوسن کا ہے یا بیلے کا، رات کی رانی ہے یا سورج مکھی۔

اس دنیا میں ان گنت لوگ پیدا ہوتے ہیں اور ایک نہ ایک دن رختِ سفر باندھنے پر مجبور ہوتے ہیں پھر بھی دنیا کی حسین دلفریبیاں جیوں کی تیوں باقی رہتی ہیں اور اس کی چہل پہل میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی جیسا کہ حضرت مجاز کا خیال ہے ؎

یہ رنگِ بہارِ عالم ہے کیوں فکر ہے تجھ کو اے ساقی
محفل تو تری سونی نہ ہوئی کچھ اٹھ بھی گئے کچھ آ بھی گئے

لیکن ہر اصول کے کچھ مستثنیات بھی ہوتے ہیں اس لیے بطور استثنیٰ بعض بلند پایہ اور ممتاز ہستیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کے گذر جانے پر دنیا سونی معلوم ہوتی ہے اور ایک عرصہ تک ان کی جدائی کا داغ نقشِ نو کی طرح دل پر تر و تازہ رہتا ہے۔ اس قسم کی قد آور ہستیوں میں سے ایک مایۂ ناز ہستی جناب وحشی شاہجہاں پوری کی بھی ہے۔

جہاں تک جناب وحشی شاہجہاں پوری کی شاعری کا تعلق ہے بقول حالی یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ شاعر اور اس کے کلام کے رتبہ کا اندازہ اس کے کلام کی قلت یا کثرت سے نہیں ہوتا بلکہ کلام کی پختگی و سنجیدگی دیکھی جاتی ہے۔ میر کی لوگ اس وجہ سے قدر نہیں کرتے کہ انھوں نے بڑے بڑے ضخیم دواوین چھوڑے بلکہ اس لیے کہ ان کے اکثر اشعار قلب میں تیر و نشتر بن کر اترتے ہیں۔ ان میں حقیقتِ سرمدی کا اظہار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو ریختہ کا سرتاج و بادشاہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ بالکل یہی صورت حضرت وحشی کے کلام کی ہے۔ انھوں نے خود "طلسمِ افکار" میں اپنے کلام کی خصوصیتیں گنوائی ہیں، لکھتے ہیں:

۱۔ میں نے اپنی غزلوں میں واسوخت کو جگہ نہیں دی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ واسوخت کے معنی ہیں محبوب سے ناراض ہونا جو شانِ محبت اور شانِ وفا کے قطعی منافی ہے۔

۲۔ میرا کلام رقابت کے مضامین سے یکسر خالی ہے۔ اس لیے کہ رقابت کا تعلق بازاری اور انتہائی بے حیائی اور پست ہمتی پر مبنی ہے۔

۳۔ میرے کلام میں خواہ مخواہ محاورات کا استعمال، صنائع بدائع کی بھرمار، بازاری بول چال اور جہلا کی زبان نہیں پائیے گا۔

۴۔ میں نے اپنی غزلوں میں کوئی ایسا شعر نہیں لکھا جو مجازی تعلقات تک محدود ہو بلکہ اسے اتنا عام رکھا ہے کہ مجازی، حقیقی، عشقی اور غیر عشقی ہر موقع پر کارآمد ثابت ہو۔

۵۔ بعض الفاظ کا استعمال میں غزل کی تہذیب کے خلاف اور رکاکت پرستی سمجھتا ہوں ان سے اپنی غزلوں کو پاک رکھا ہے مثلاً میری جان۔ جانِ من۔ معشوق۔ دلربا، بشرطیکہ وہ دوسرے لفظ کی صفت میں واقع نہ ہوں۔

۶۔ میں نے تخیل کے لیے زبان کو اور زبان کے لیے تخیل کو برباد نہیں کیا ہے۔

انھوں نے اپنے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ ان کے اشعار انسانی کیفیات، جذبات، واردات، مشاہدات اور محسوسات پر مبنی ہیں۔

افسوس ہے کہ حضرت وحشی کے عربی، فارسی اور اردو کلام کا بیشتر حصہ ہم تک نہیں پہونچا۔ جو کچھ تھا وہ ان کے بعد استبدادِ زمانہ کے ہاتھوں اور کچھ ان کی زندگی ہی میں ان کی شانِ بے نیازی کی وجہ سے تباہ و برباد ہو گیا۔ ان کے اردو کلام کی بساط کل ۶۰ غزلوں اور تیرہ نظموں پر مشتمل ہے جن میں کم و بیش ۸۰۰ اشعار ہیں۔ ان منتخب اشعار میں سے بھی حضرت وحشی کو صرف ۹۸ اشعار پسند ہیں جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی نظر میں شعر کا جو بلند معیار ہے وہ بالعموم کتنا کمیاب ہے۔ ان کی غزلوں میں مطالب نہ تو اتنے چھپے ہوئے ہیں کہ "چشمانِ تو زیرِ ابرو اند" اور نہ وہ ایسی معمائی چیستانی صورت رکھتے ہیں کہ

گُل کو باغ میں جانے نہ دینا
کہ ناحق خون پروانے کا ہوگا

یہی حالت زبان کی ہے کہ نہ تو "تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا" کی تقلید کر کے اسے مصنوعی بنایا گیا ہے اور نہ "اُدھر جانا، اِدھر جانا، اُدھر جانا، اِدھر جانا" کی طرح ابتذال کی صدائیں بلند کی گئی ہیں۔ نمونہ کے طور پر حضرت وحشی کے کچھ منتخب اشعار پیش کیے جاتے ہیں ؎

مرے پہلو سے تم اٹھتے تو اک محشر بپا ہوتا   تمہیں ہنگامۂ جوشِ تمنا کی خبر کیا ہے

رعنائی خیال کا منت پذیر ہوں   ممنون ہے ورنہ بزمِ بتاں میں گذر کہیں

افسانہ گو ہیں داغ تو بیشک ادھر ادھر   پہلو میں اب نہ دل ہے نہ وحشی جگر کہیں

ہائے نہ مجھ سے شبِ وعدہ تصور کے فریب   جدھر آنکھ اٹھائی تری صورت دیکھی

شاید اب اس کی بارگہِ ناز ہے قریب   مجھ میں قدم اٹھانے کی طاقت نہیں رہی

جذبۂ شوق دکھائے اگر اعجاز مجھے — در و دیوار سے آنے تری آواز مجھے

کوئی تدبیر ہو لیکن شبِ غم ختم نہیں ہو سکتے — وہ آنسو جن کو عادت رہ چکی ہے تیرے داماں کی

کوئی سایہ بھی تو نظر پڑا نہ فضائے شوق میں مجھ کو — مگر اس کے پیکرِ ناز میں کہ تب سے جسم بھی بار ہے

یہ تری تصویر و پردہ ہے کہ ذوق آرزو برہم ہے — نیم نشاط درگزر نگاہ کو تری خامشی سے

اس جلوہ کا مطلب کیا سمجھوں آسان بھی ہے دشوار بھی ہے
ابرو پہ بل ہونٹوں پہ ہنسی انکار بھی ہے اقرار بھی ہے
جس طرح ہوا کی زندانی ہم آزاد حدودِ زنداں میں
اس دام گہِ ہستی میں بشر مجبور بھی ہے مختار بھی ہے

حضرت وحشی کو قدرت نے بچپن ہی سے ذوقِ شعری سے نوازا تھا۔ وہ چار پانچ سال کی عمر ہی میں طفلانہ آزادی کے ساتھ خواہ مخواہ بے معنی جملوں کی رٹ لگاتے تھے جن میں سے بعض مقفّیٰ اور بعض موزوں ہوتے تھے جو اس بات کا پتہ دیتے تھے کہ اگر موقع ملے تو ان میں بہترین شاعر بننے کی صلاحیت موجود ہے۔ حسنِ اتفاق سے ان کو حضرت علامہ محمد فاروق چریاکوٹی کا شاگرد بننے کا شرف حاصل ہوا۔ علامہ ممدوح اپنے وقت کے بہت بڑے فاضل اور استاذ الاساتذہ تھے آپ کو ادب سے خاص ذوق تھا۔ اردو فارسی اور عربی میں بہترین شعر کہتے تھے۔ حضرت علامہ ممدوح کے فیضِ صحبت سے جناب وحشی کے ذہن و حافظہ میں قدرت کی جو امانتیں تھیں وہ بے نقاب ہونے لگیں۔ دار العلوم ندوہ میں کہ جہاں حضرت وحشی حصولِ تعلیم کے لیے قیام پذیر تھے آئے دن ملک کے نامور ادیب، علما و امرا معائنہ کے لیے آتے رہتے تھے۔ ایک دن بدایوں کے ایک معمر رسیدہ بزرگ جو اپنے زمانہ کے بہترین عربی عالم، ادیب اور شاعر بھی تھے تشریف لائے انھوں نے حضرت وحشی کا امتحان لیا عربی کے چند اشعار کی تقطیع کرائی اور زحافات دریافت کیے حضرت وحشی نے بے تامل جواب دیے جس سے وہ حیرت زدہ رہ گئے انھوں نے یہ واقعہ دہلی کے ایک اخبار کرزن گزٹ میں شائع کرایا کہ دار العلوم لکھنؤ میں ایک ایسا لڑکا بھی ہے جو کمسنی کے باوجود ایک زبردست عروضی ہے یہ واقعہ ۱۹۰۲ء کا ہے جبکہ حضرت وحشی کی عمر صرف بارہ سال کی تھی صرف اسی واقعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ موصوف کو قدرت نے کیا ذہنِ رسا عطا فرمایا تھا۔ بسلسلۂ تعلیم جناب وحشی کو لاہور کا سفر کرنا پڑا جہاں کا ماحول ان کی عربی شاعری کے لیے قطعی ناموزوں تھا اس لیے وہاں جب عربی شاعری کا میدان جولانیٔ طبع کے لیے تنگ ہوا تو قدرت کی ودیعت نے اردو شاعری کا رخ کیا اور اسلامیہ کالج لاہور کے نامور پروفیسر حضرت مولانا روحی کے کہنے سے اپنا تخلص وحشی تجویز کیا۔ لاہور ہی میں انھیں اس قسم کے مواقع میسر آئے جن سے ان کی صلاحیتوں کو جلا ملی۔ لاہور میں ایک موقع پر علما کے ایک جلسہ میں جس کی صدارت حضرت مولانا [illegible] نے فرمائی تھی جناب وحشی نے ایک نظم پڑھی جسے صاحبِ صدر اور دیگر علمائے کرام نے بہت پسند فرمایا۔ موصوف کی ایک نظم جو اشاعت القرآن لاہور کے ایک عظیم الشان جلسے میں پڑھی گئی تھی اس قدر مقبول ہوئی کہ اس کا ایک ایک شعر دس دس بار پڑھوایا گیا اور ہر بار [illegible] کی بارش ہوتی رہی۔ افسوس ہے کہ یہ نظمیں ہم تک نہیں پہونچ سکیں کوشش میں ہوں کہ وہ مل جائیں تو ان کی اشاعت کروں۔

ان واقعات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے زمانۂ طالب علمی ہی سے ایک مقبول شاعر بن چکے تھے لیکن بقول مولانا محمد علی مرحوم جناب وحشی ملک میں معروف نہیں ہو سکے جس کی وجہ کچھ تو موصوف کی خودداریٔ طبع اور کچھ شانِ استغنا ہے جس کو جناب وحشی نے خود تسلیم کیا ہے ؎

غمِ ستم ہے نہ فکرِ ساماں نہ خطرۂ جاں نہ خوفِ طوفاں
کبھی نہ بدلوں جو کوئی بدلے تو زندگی میری مفلسی سے

جناب وحشی کا جو کلام ہم تک پہونچا ہے وہ اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں جو ضائع ہو گیا اور مجموعۂ نثر سے تو اس کو کوئی مناسبت ہی نہیں جو لاکھوں صفحات پر مشتمل ہے۔ ضرورت ہے کہ [illegible] علم حضرات جناب وحشی شاہجہاں پوری کے مجموعۂ نثر و نظم کا جائزہ لے کر ادبی خدمت انجام دیں۔

مراسلات

سردار جعفری کی ایک ساقط الوزن غزل

حال رواں میں سردار جعفری کی ایک نئی کتاب "پیراہن شرر" حلقۂ ادب بمبئی نے شائع کی ہے جس کے صفحات ۹۔۱۰ پر ایک غزل چھپی ہے جو ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

وہی ہے وحشت، وہی ہے نفرت، آخر اس کا کیا ہے سبب
انساں انساں بہت رٹا ہے، انساں انساں بنے گا کب
وید، اپنشد، پرزے پرزے، گیتا، قرآں ورق ورق
رام و کرشن و گوتم و یزداں، زخم رسیدہ سب کے سب
اب تک ایسا ملا نہ کوئی، دل کی پیاس بجھاتا جو
یوں میخانہ چشم بہت ہیں بہت ہیں یوں تو ساقی لب
جس کی تیغ ہے دنیا اس کی جس کی لاٹھی اس کی بھینس
سب قاتل ہیں، سب مقتول ہیں، سب مظلوم ہیں، ظالم سب
خنجر خنجر، قاتل ابرو، دلبر ہاتھ، مسیحا ہونٹ
لہو لہو ہے شام تمنا، آنسو آنسو، صبح طرب
دیکھئے دن پھرتے ہیں کب تک، دیکھئے پھر کب ملتے ہیں
دل سے دل، آنکھوں سے آنکھیں، ہاتھ سے ہاتھ اور لب سے لب
زخمی سرحد، زخمی قومیں، زخمی انساں، زخمی ملک
حرف حق کی صلیب اٹھائے کوئی مسیح تو آئے اب

اس کی تقطیع حسب ذیل طور پر کی جا سکتی ہے

وہی ہِ وحشت وہی ہِ نفرت آخر اس کا کیا ہ سبب
فعولُ فعلن فعولُ فعلن فعلن فعلن فعْلُ فعل

انسا انسا بہت رٹا ہے انسا انسا بنے گ کب
فعلن فعلن فعولُ فعلن فعلن فعلن فعولُ فع

وید اپ نی شد پرزے پرزے گیتا قرآ ورق و رق
فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعولُ فع

رام و کرشن و گوت م و یزدا زخم رسیدہ سب کے سب
فعْلُ فعولن فعْلُ فعولن فعْلُ فعولن فعلن فع

اب تک اب ملا ن کوئی دل کی پاس بجاتا جو
فعلن فعلن فعولُ فعلن فعلن فعْلُ فعولن فع

یوں مے خانہ چشم بہت ہے بہت ہ یوں تو ساقی لب
فعلن فعلن فعْلُ فعولن فعولُ فعلن فعلن فع

جسکی تیغ ہ دنیا اسکی جسکی لاٹھی اسکی بھینس
فعلن فعْلُ فعولن فعلن فعلن فعلن فعلن فاع

سب قا تل ہے سب مق تول ہے سب مظلو م ظالم سب
فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعْلُ فعولن فع

خنجر خنجر قاتل ابرو دلبر ہات مسیحا ہونٹ
فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعْلُ فعولن فاع

لہو لہو ہے شام تمنا آنسو آنسو صبح طرب
فعولُ فعلن فعْلُ فعولن فعلن فعلن فعْلُ فعل

دیکھیے دن پھرتے ہیں کب تک دیکھیے پھر کب ملتے ہیں
فعْلُ فعولن فعلن فعلن فعْلُ فعولن فعلن فع

دل سے دل آ کھوں سے آکھے ہات میں ہات اَر لب سے لب
فعلن فعلن فعلن فعلن فعْلُ فعولن فعلن فع

زخمی سرحد زخمی قومے زخمی انسا زخمی ملک
فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فاع

حرفے حق کو صلیب اٹھائے کوئی مسیحا آئے اب
فعلن فعلن فعولُ فعولن فعْلُ فعولن فعلن فع

اس تقطیع کی روشنی میں یہ پتہ چلتا ہے کہ اس غزل میں زیادہ تر ارکان بحر متقارب کے استعمال ہوئے ہیں لیکن اصولی طور پر اس کے ارکان کی ترتیب کو شاعر برقرار نہیں رکھ سکا ہے۔ اس غزل کا ہر مصرع دوسرے مصرعوں سے ارکان کی ترتیب میں جداگانہ حیثیت رکھتا ہے اس لیے پوری غزل مجوزہ اصول و فن عروض کے تحت نہ ہونے کے باعث ساقط الوزن کہی جانے کی مستحق ہے۔ ہمیں سردار جعفری جیسے عظیم المرتبت شاعر سے ہرگز یہ امید نہ تھی کہ وہ اس بحر میں ایسے ایسے غوطے کھائیں گے۔

(انجمن آرا انجم ریسرچ اسکالر)

یہ شعر کس کے ہیں

بادۂ آں در خورِ ہر ہوش نیست　　حلقۂ آں سخرہ ہر گوش نیست

رشتہ در گردنم افگندہ دوست　　می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

ہیچ قومے را خدا رسوا نکرد　　تا دلِ صاحب دلے نامد بدرد

کارساز ما بفکر کار ما　　فکر ما در کار ما آزار ما

اے ترا با ہر دلے رازے دگر　　ہر گدا را بر درت نازے دگر

اگر طبع خواہد زمن سلطان دیں　　خاک بر فرق قناعت بعد ازیں

مآخذ کا حوالہ دیا جائے۔ مثنوی روم کی صورت میں دفتر بھی بتایا جائے

(م)

مہاراشٹر سکنڈری بورڈ کا "انتخاب اردو"

مہاراشٹر سکنڈری ایجوکیشن بورڈ نے ۷۷-۱۹۷۶ء کے امتحانات کے لیے اردو کا انتخاب شائع کیا ہے جو کئی حیثیتوں سے اردو کی ایک

معیاری درسی کتاب ہے۔ جو اسباق اس میں درج ہیں، بورڈ نے ان کے لیے مصنفوں سے باضابطہ اجازت حاصل کی ہے بلکہ انھیں معقول رائلٹی بھی دینا منظور کیا ہے۔ یہ شاید اداروں کی تصنیف و اشاعت کی دنیا کے لیے کچھ غیر معمولی بات ہے۔ "انتخاب اردو" کی عام درسی کتابوں سے جدا حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں ایسے اسباق لیے گئے ہیں جو ادبی اور معیاری ہونے کے علاوہ مقصدی ہیں۔ حسنِ انتخاب کے ساتھ وہ فہرست معانی اور نوٹ بھی قابلِ تعریف ہیں جو ہر سبق سے متعلق بڑی احتیاط اور طلبہ کی ضرورتوں کا پورا لحاظ رکھ کر تیار کیے گئے ہیں۔ بورڈ نے انتخاب کی ایک جلد نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی خدمت میں پیش کی تھی موصوف نے بورڈ کو خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار اس طرح کیا:۔

"میں نے انتخاب اردو کا سرسری طور پر مطالعہ کیا، انتخاب نہایت عمدہ اور اس کے تشریحی نوٹ بہت مناسب ہیں میں نہیں جانتا کہ کسی اور دوسرے ایجوکیشنل بورڈ نے اردو کے امتحان کے لیے اس انتخاب کے جیسی عمدہ نصابی کتاب تیار کی ہو۔"

"انتخاب اردو" (۲۸۰ صفحات) اعلیٰ پیمانے کے دیدہ زیب ٹائپ میں چھپی ہے۔ اس کے باوجود اس کی قیمت صرف دو روپے چالیس پیسے مقرر کی گئی ہے۔ اس قیمت میں کتب فروش کا کمیشن اور سکنڈری بورڈ کی رائلٹی اور ناشر کا منافع بھی شامل ہے۔ یہ بات ان لوگوں کے غور کرنے کی ہے جو ٹائپ کی چھپائی کو مہنگا سمجھتے ہیں۔

سکنڈری بورڈ نے جس کمیٹی کے ذمے انتخاب اور ترتیب کا کام سپرد کیا تھا اس کے کنوینر پرنسپل سید شہاب الدین دسنوی اور ارکان میں پروفیسر عصمت جاوید، ڈاکٹر بھگوت دیال ورما اور پروفیسر نجیب اشرف ندوی تھے۔ کتاب سکنڈری بورڈ کی طرف سے ادبی پبلشرز نے شائع کی ہے۔ جن ریاستوں میں ہائی اسکول کے امتحانات کے لیے اردو کی نصابی کتاب شائع نہیں ہوئی ہے وہ اس کتاب سے اپنی ضرورت پوری کرسکتے ہیں۔

(ایک نامہ نگار)

مومن کا ایک شعر

دفن جب خاک میں ہم سوختہ ساماں ہوں گے
فلس ماہی کے گلِ شمعِ شبستاں ہوں گے

ہماری زبان مورخہ یکم اکتوبر ۱۹۶۶ء میں پروفیسر کرامت علی صاحب کرامت نے شعور تحت الشعور، غیر ارادی شعور اور ماقبل شعور کی کارفرمائی کے پیش نظر مومن کے مندرجۂ بالا شعر کی تشریح و تنقید اس طرح فرمائی ہے:

"ایک مچھلی جس پر ایک گائے نے اپنے دو سینگوں میں دنیا کو اٹھا رکھا ہے، اس کا چمکتا ہوا فلس گلِ شمعِ شبستاں ہوگا۔ بلکہ ایک نادر اور گراں قدر چیز ہوگا۔ الغرض مومن کے اس شعر میں شاعر کی ماورائی اصلیت تکلف کے درمیان کھو کے رہ گئی ہے اور کیفیتوں کے ابلاغ کے دوران کہیں کہیں جذبات کی اضافی فراوانی کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔"

اس کے بعد ہماری زبان مورخہ ۸ر نومبر ۱۹۶۶ء کے شمارے میں ڈاکٹر ذکی حسین صاحب نے اپنے ادبی مطالعہ کی وسعت کے لحاظ سے اس شعر کا یہ مطلب بیان کیا ہے:۔

"مومن کہتا ہے کہ محبت کے سوختہ ساماں دفن ہونے کے بعد تاریکی و تنہائی میں نہیں رہتے بلکہ ان کی قبر میں شبستاں کی سی کیفیت و حالت رہتی ہے۔ شمع کی روشنی کا یہ عالم ہے کہ اس کے گل میں بھی ویسی ہی چمک رہتی ہے جیسی فلس ماہی میں بتائی جاتی ہے۔ گل جو شمع سے علحدہ ہوتے ہی بجھ جاتا ہے محبت کرنے والوں کی قبر میں چمکتا رہتا ہے۔ اس لیے کہ محبت کرنے والوں سے دنیا کی رونق اور چہل پہل انھیں کی ذات پر انحصارِ کائنات ہے۔"

پروفیسر کرامت علی صاحب کرامت کا مفہوم تشنۂ تشریح ہے اور ڈاکٹر ذکی حسین صاحب نے مصرعِ ثانی کے "گلِ شمعِ شبستاں" کو مبتدا اور "فلس ماہی" کے ٹکڑے کو خبر مانا ہے حالانکہ شاعر کی ترتیب الفاظ بتا رہی ہے کہ "فلس ماہی" کے مبتدا ہے اور "گلِ شمعِ شبستاں" خبر ہے۔ میرے خیال میں اس شعر کا سیدھا سادہ مطلب یہ ہے:۔

"مومن کہتا ہے کہ عشق کی آگ ایسی لگی ہے کہ مرنے کے بعد بھی جب ہم سوختہ ساماں خاک میں دفن ہوں گے (قبر میں نہیں۔ حالانکہ خاک اور قبر کا وزن ایک ہے مگر شاعر نے لفظ قبر کو اس لیے چھوڑ دیا کہ اس سے مفہوم محدود ہو جاتا ہے) تو آتشِ عشق کا اثر طبق در طبق خاک کی اس حد تک پہنچ جائے گا جہاں تمام کرۂ خاکی کا بوجھ ایک مچھلی پر ہے اور وہ مچھلی شمعِ شبستاں کے مانند جلنے لگے گی اور اس کا ہر فلس ایک گل بن جائے گا۔"

(ریورنڈ جنیس ریحانی)

مگدھ یونیورسٹی میں ۶۸-۱۹۶۷ء سے پوسٹ گریجویٹ اردو تعلیم شروع ہو جائے گی

گیا: معلوم ہوا ہے کہ مگدھ یونیورسٹی کی سینیٹ نے متفقہ طور پر ۶۸-۱۹۶۷ء سے پوسٹ گریجویٹ اردو کلاس کھولنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس ضمن میں معلوم ہوا ہے کہ پوسٹ گریجویٹ پڑھائی کے لیے ایک یونیورسٹی پروفیسر ایک ریڈر اور تین لکچرر بحال کیے جائیں گے۔ معلوم ہونا چاہیے کہ مگدھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب زوار حسین صاحب نے نمائندہ روشنی کو دوران انٹرویو میں بتایا تھا کہ وہ آئندہ تعلیمی سال سے پوسٹ گریجویٹ اردو کی پڑھائی کا سلسلہ جاری کرنے کے لیے کوشش کر رہے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ سینیٹ کے اجلاس سے جناب کلام حیدری اور ان کی اہلیہ محترمہ شاہ قمر حیدری صاحبہ (دونوں ہی سینیٹ کے ممبر ہیں) غیر حاضر رہے تھے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اس خبر کے عام ہوتے ہی بہار کے اردو داں طبقہ کی جانب سے وائس چانسلر جناب زوار حسین صاحب کو کثیر تعداد میں مبارک بادی کے تار اور خطوط موصول ہو رہے ہیں۔

(روشنی)

جدیدیت اور اردو شاعری

علی گڑھ ۱۰ ردسمبر ۶۶ء۔ انجمن اردوئے معلی شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ایک جلسہ جناب مجنوں گورکھپوری کی صدارت میں ہوا۔

اس جلسہ میں پروفیسر آل احمد سرور نے اپنا انگریزی مقالہ "جدیدیت اور اردو شاعری" پڑھا۔ یہ مقالہ موصوف نے شملہ کے اس سیمینار میں پڑھا تھا جو اکتوبر میں منعقد ہوا تھا اور جس میں ہندوستان کی تمام قومی زبانوں کے ادیبوں نے شرکت کی تھی۔ مقالہ سے پہلے سرور صاحب نے شملہ کے اس سیمینار کی مختصر روداد سنائی۔ انھوں نے کہا کہ اس سیمینار میں جدیدیت کی مختلف تعریفوں اور نوعیتوں پر سیر حاصل بحث کی گئی۔ جو مسائل زیر بحث آئے ان میں مغرب اور مشرق کے ان تمام سائنسی، فکری، ادبی اور تہذیبی رجحانات کا جائزہ لیا گیا جنھوں نے جدید ذہن کی تعمیر و تشکیل میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ پس منظر کے طور پر ہندوستان کے ماضی اور اس کی تہذیبی روایات کا جائزہ بھی لیا گیا۔ سیمینار میں عام طور سے اس بات پر اتفاق کیا گیا کہ جدید (MODERN) اور ہم عصر (CONTEMPORARY) پر الگ الگ گفتگو کرنا چاہیے۔

بنگالی کے مشہور صحافی اور ادیب پروفیسر بوس کے اس خیال کو بڑی حد تک پسند کیا گیا کہ جدیدیت پر حکم لگانے کے بجائے پہلے اس کو ہمدردی اور توجہ کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔

سیمینار میں جو مقالے پڑھے گئے اور تقریریں کی گئیں ان کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے سرور صاحب نے کہا کہ مجھے اس بات سے خوشی ہوئی کہ ہندوستان کی مختلف زبانوں کے ادبی رجحانات میں بڑی مماثلت پائی جاتی ہے اور ہندوستان کی تہذیبی وحدت اس طرح اور استوار اور مستحکم نظر آتی ہے۔

اپنے مقالے کے سلسلے میں سرور صاحب نے کہا کہ یہ مقالہ چونکہ ایسے لوگوں کے لیے لکھا گیا تھا جو اردو ادب کے جدید رجحانات کے ارتقا سے پوری طرح واقف نہیں تھے، اس لیے اس میں میں نے پس منظر کے طور پر ان تمام تحریکات کا جائزہ بھی لیا ہے جنھوں نے جدید ادب کے لیے راہ ہموار کی۔ اپنے خیالات کو زیادہ جامع بنانے کے لیے میں نے نمائندہ نظموں کے انگریزی ترجمے بھی پیش کیے ہیں۔ مجھے ایلیٹ کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ شاعری کا ترجمہ ممکن نہیں۔ لیکن یہ تراجم ناگزیر تھے اور یہ خوشی کی بات ہے کہ ان تراجم سے سیمینار میں شرکت کرنے والوں کو اردو شاعری کے بارے میں ایک سنجیدہ رائے قائم کرنے کا موقع ملا۔

تمہیدی تقریر کے بعد سرور صاحب نے اپنا مقالہ پڑھا۔ مقالہ میں غالب سے لے کر موجودہ دور تک ان تمام رجحانات کا جائزہ لیا گیا ہے جو کسی نہ کسی طرح جدیدیت کے ذیل میں آتے ہیں۔ ہم عصر جدید شاعری کے امکانات اس کے مثبت اور منفی پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ میں شاعری کی موجودہ روش سے مایوس نہیں ہوں اور اس کے کارناموں کی قدر کرتا ہوں۔ انھوں نے ہندوستان اور پاکستان کے بعض نمائندہ جدید شاعروں کی شعری تخلیقات کے انگریزی ترجمے مثال کے طور پر پیش کیے۔

انھوں نے اختر الایمان، منیب الرحمٰن، خلیل الرحمٰن اعظمی، وحید اختر، عمیق حنفی، بلراج کومل، راہی، شہریار اور ن م راشد، احمد ندیم قاسمی، مجید امجد، مختار صدیقی، ابن انشا، وزیر آغا، ناصر کاظمی، جیلانی کامران، منیر نیازی، جمیل الدین عالی، جعفر طاہر، افتخار جالب وغیرہ کے کلام سے کچھ مثالیں دے کر ہندوستان اور پاکستان کے اردو شعرا کے میلانات کو واضح کیا۔

آخر میں صدر جلسہ مجنوں گورکھپوری نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ سرور صاحب ہمیشہ صاف شفاف اور ٹھوس بات کہتے ہیں۔ یہ خوبی ان کے اس مقالے میں بھی ہے۔ Modernism اور Modernity کے سلسلے میں مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ اول الذکر ایک خبط ہے جبکہ آخر الذکر لابدی اور فطری عمل ہے۔ Modernity سے گھبرانے اور اسے روکنے کی کوشش ایک رجعت پسند فعل ہے اور بڑا خطرناک ہے۔ لیکن ہمیں اس سلسلے میں ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے کہ Modernity کے بارے میں غیر صحت مند رجحانات عام نہ ہونے پائیں۔

سکریٹری کے شکریے کے ساتھ جلسہ کا اختتام ہوا۔

(ایک نامہ نگار)

شب گزیدہ کی رسم اجرا

مشہور افسانہ نگار قاضی عبدالستار کے نئے ناول "شب گزیدہ" کی اشاعت پر یکم دسمبر ۱۹۶۶ء کو ۴ بجے شام کے وقت فیکلٹی لاؤنج میں

جلسہ تہنیت ہوا۔ ہندی کے شاعر اور نقاد ڈاکٹر رودیندر بھرمر نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ قاضی عبدالستار نہ صرف اردو کے بلکہ ہندی کے بھی ان فنکاروں میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے اس عہد کے ادب کو متاثر کیا ہے اور اپنے اسٹائل کی چھاپ لگائی ہے اور اودھ کے دیہات کا ماحول جن کا خاص میدان ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر ڈی این شکلا نے تقریر میں قاضی صاحب کے تکنیک آرٹ کا تجزیہ کیا اور کہا کہ حقیقی فضا آفرینی اور کردار نگاری کے علاوہ قاضی صاحب کے اسٹائل نے بھی جادو سا کیا ہے۔ پنجابی افسانہ نگار جسونت سنگھ ودیہی نے اپنے مقالے میں لکھا کہ "شب گزیدہ" دو نظاموں کے ٹکراؤ کی سمبالک کہانی ہے۔ آخر میں صدر جلسہ پروفیسر آل احمد سرور صاحب نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ علاقائیت Regionalism بھی جدید عہد کی دین ہے اور قاضی صاحب کے ناول اس رنگ میں نمایاں اور منفرد مقام کے مالک ہیں۔

(ڈاکٹر رودیندر بھرمر)

سری نگر میں ایک ادبی انجمن کا قیام

ریاست کے سرکردہ ادیبوں اور شاعروں نے یہاں جناب عبدالقادر سروری کی صدارت میں ایک ادبی انجمن کا قیام عمل میں لایا گیا ہے جس کا نام جھرنا ادبی بزم رکھا گیا ہے۔ اس انجمن کے اغراض و مقاصد اور اس کا آئین مطبوعہ صورت میں شائع ہو گیا ہے۔ اس ادبی انجمن کا ماہوار رسالہ "جھرنا" کے نام سے جاری ہونے والا ہے۔

اس انجمن کو اردو اور ریاستی زبانوں کو فروغ دینے کے لیے عمل میں لایا گیا ہے۔ ماہنامہ "جھرنا" سرینگر کے دفتر پر پچھلے دنوں یہاں کے ادیبوں اور شاعروں اور ناقدوں کا ایک اجلاس بلایا گیا تھا۔ اس اجلاس میں ایک کمیٹی کا قیام عمل میں آیا تھا۔ اس کمیٹی کی سفارشات سے "جھرنا" ادبی بزم کے نام سے ایک انجمن قائم کی گئی جس کی مجلس انتظامیہ کا انتخاب ہوا۔ مجلس انتظامیہ نے ایک آئین مرتب کیا جس کی رو سے مجلس انتظامیہ کے پانچ عہدیدار اور سات رکن ہوئے جن کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔

عہدیدار

۱۔ صدر جناب عبدالقادر سروری۔ ۳۔ معتمد جناب قاضی نصیر فرخ
۲۔ نائب صدر جناب دینا ناتھ نادم۔ ۴۔ نائب معتمد جناب شبنم قیوم
۵۔ خازن۔ جناب پدم ناتھ گنجو

اراکین

۱۔ جناب محمد حسین رضوی ۲۔ جناب غلام رسول سنتوش
۳۔ جناب حبیب اللہ حامدی ۴۔ جناب علی محمد لون
۵۔ جناب مرزا کمال الدین شیدا ۶۔ جناب نند لال طالب
۷۔ جناب مہندر رینہ

مجلس انتظامیہ نے مزید سفارش کی کہ اس کا ایک سرپرست اور نائب سرپرست بھی ہوگا۔ سرپرست کے لیے جناب غلام محمد صادق چیف منسٹر کا نام تجویز کیا گیا اور صدر کے لیے وزیر تعلیم کا نام تجویز کیا گیا۔ اس انجمن کی ایک شاخ عنقریب ہی جموں میں بھی قائم کی جائے گی۔

(شبنم قیوم۔ نائب معتمد)

انجمن اردو ہریانہ روہتک کا میمورنڈم

انجمن اردو ہریانہ روہتک کی جانب سے جناب وزیر اعلیٰ ہریانہ پردیش کی خدمت میں اردو زبان کو ہریانہ کی علاقائی زبان قرار دیے جانے کے متعلق باقاعدہ میمورنڈم پیش کر دیا گیا۔

روہتک ۵ دسمبر ۶۶ء دوپہر کو عزت مآب جناب وزیر اعلیٰ ہریانہ پردیش کی خدمت میں استقبالیہ اجلاس کے موقع پر جناب کندن گوڑگانوی کنوینر انجمن اردو ہریانہ روہتک نے باقاعدہ طور پر اردو زبان کو ہریانہ کی صوبائی علاقائی زبان قرار دیے جانے کے متعلق ایک میمورنڈم پیش کیا۔ آپ نے میمورنڈم پیش کرتے ہوئے کہا کہ "اردو" جو لشکری زبان ہے اور یہ ہریانہ جو فوجی علاقہ ہے حقیقتاً یہیں کی پیداوار ہے۔ اس فوجی علاقہ کے بہادروں اور سلطانی ترکی افغانوں، ترکوں، ایرانیوں اور مغلوں کے اختلاط سے ہی اردو زبان کی ابتدا ہوئی ہے اور اس کی پیدائش کا صحیح مقام ہریانہ اس لیے ہے کہ یہ علاقہ دہلی پایہ تخت کا صوبہ رہا ہے اور دہلی ایک طور پر اسی علاقہ کا ایک حصہ ہے آپ نے کہا کہ ہمیں قوی امید ہے کہ آپ کی رہنمائی و قیادت میں جہاں ہریانہ کی ترقی و تعمیر کی توقعات وابستہ ہیں اردو زبان جو آج بھی اس علاقہ کی علمی ذخیرہ اور کاروباری زبان ہے اس کو بھی نظر انداز نہیں کیا جائے گا بلکہ عوام کے رجحان و مذاق کے مطابق اردو زبان کو علاقائی زبان تسلیم فرما کر اردو زبان کو اس کا جائز مقام عطا کریں گے وزیر اعلیٰ نے جوابی تقریر میں فرمایا کہ یہ ملک جس میں متعدد مذاہب اور مختلف زبانیں ہیں چالیس کروڑ آبادی کا ملک ہے یہ گلہائے رنگا رنگ کا ایک چمن ہے اور ہریانہ بھی اسی کا ایک گلدستہ ہے یہاں ہر شخص کو اپنے مذہب پر عمل کرنے اور زبان کے استعمال کی آزادی ہے اور سیکولر جمہوری نظام میں ہر فرد کا یہ حق تسلیم شدہ ہے ہریانہ میں بھی نہ کسی کی حق تلفی ہوگی اور نہ کسی کے ساتھ زیادتی کی جائے گی ہم یہ چاہتے ہیں کہ جمہوریت میں سب کے مساوی حقوق کے لحاظ سے برتاؤ کیا جائے یہی ہماری پالیسی ہے اور یہی ہمارا متفقہ فیصلہ ہے اور ہم اسی کے پابند رہیں گے۔

(سید طالب القادری)

مجاز بنیادی طور سے ایک رومانوی شاعر تھے

یاد مجاز کے پروگرام میں آنند نرائن ملا کی تقریر

لکھنؤ۔ شاعر شہر نگاراں اسرار الحق مجاز کی گیارہویں برسی کے موقع پر پریس کلب میں نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی جانب سے یاد مجاز کا انعقاد کیا گیا جس میں مجاز کی شاعری اور شخصیت کے مختلف گوشوں کو تقریروں کے ذریعہ اجاگر کیا گیا۔

اس موقع پر مجاز کی شاعری پر ایک سمپوزیم کا اہتمام بھی کیا گیا تھا جس کا عنوان تھا کہ مجاز کی شاعری رومانوی تھی یا انقلابی سمپوزیم میں

حصہ لیتے ہوئے مشہور شاعر آنند نرائن ملا نے کہا کہ مجاز ایک رومانوی شاعر تھے اور ان میں ایک بڑے شاعر بننے کی خصوصیات تھیں ان کی شاعری میں انفرادیت تھی لیکن ان کی ناگہانی موت نے اردو سے ایک بڑا شاعر چھین لیا۔

ملا صاحب نے کہا کہ مجاز بنیادی طور پر رومانوی شاعر تھے اور اپنے احباب کی وجہ سے وہ ایسی شاعری نہ کر سکے جیسی کرنا چاہیے تھی

انھوں نے کہا کہ اپنے اندرونی تضاد اور کشمکش کی وجہ سے وہ الجھ کر رہ گئے اور ان کی شاعری زوال کا شکار ہو گئی۔

اوصاف احمد نے سمپوزیم میں تقریر کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ مجاز رومانی سے زیادہ انقلابی شاعر تھے انھوں نے اپنا نظریۂ شاعری سوچ سمجھ کر قبول کیا تھا اور وہ محض احباب یا گروہ کا اصرار نہ تھا۔

انھوں نے کہا کہ اگر مجاز نے اپنے نظریات اور عقائد سوچ سمجھ کر قبول نہ کئے ہوتے تو ان کی شاعری میں بقائے دوام کی خصوصیات نہ ہوتیں۔ محمود الحسن رضوی نے کہا کہ مجاز کی شاعری میں رومانوی اور انقلابی دونوں عناصر ہیں اور ہم کسی بھی شاعر کی تقسیم ان خانوں میں نہیں کر سکتے۔ احمد ابراہیم علوی نے کہا کہ مجاز اپنی فطرت کے باعث حسن و عشق کے شاعر تھے اور ان کی زیادہ تر نظمیں رومانی نظمیں ہیں۔ لیکن انھوں نے اپنے عہد کے دوسرے شعراء کی طرح اپنے دور کے سیاسی حالات سے اثر قبول کیا۔

جلسے میں حمید افشان ثانی اور ابن حسن وغیرہ نے مجاز کی شخصیت پر بھی روشنی ڈالی اس جلسے کا اہتمام ینگ سوشل سوسائٹی نے کیا تھا۔

بزم ادب پٹنہ کالج و پٹنہ یونیورسٹی کا سالانہ جلسہ

مشہور و معروف شاعر جگن ناتھ آزاد بھی شریک ہوئے

پٹنہ، مباحثہ کی نشست سے بزم ادب پٹنہ کالج و پٹنہ یونیورسٹی کے سالانہ جلسہ بتاریخ ... کے دو روزہ پروگرام کا آغاز ہوا۔ اس نشست کی صدارت شعبۂ لسانیات کے صدر جناب ڈاکٹر محمد حسن صاحب نے فرمائی مباحثہ میں جناب محمد کمال الدین شہید اور جناب محمد مظفر الحسن نے بزم ادب کی جانب سے، جناب سعید اختر اور شفیق زاہد نے بزم سخن سائنس کالج کی جانب سے، ... اور قاضی حمید الوارث صاحبان نے جمعیۃ الطلبہ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کی جانب سے اور محمد عزیز شمسی اور ... حسین آزاد نے پٹنہ سٹی ادارہ تحقیقات عربی و فارسی کی جانب سے شرکت کی۔

ججوں کے فیصلے کے مطابق مجلس ادب کی ٹیم اول آئی اور جناب سعید اختر بہترین مقرر منتخب قرار دیئے

تحریری مقابلہ میں بھی جناب سعید اختر کو ججوں نے اول انعام کا مستحق قرار دیا۔

طلبہ و اساتذہ کی کثیر تعداد اس مباحثہ کو سننے کے لیے موجود تھی۔ معتمد بزم ادب سید رضوان علی اصلاحی کے شکریہ پر یہ پروقار اور پرسکون نشست تقریباً سوا سات بجے برخاست ہوئی۔

اس جلسہ میں جناب جگن ناتھ آزاد بحیثیت مہمان خصوصی شریک ہوئے۔ بعد میں جناب صدر کے اصرار پر جناب آزاد نے بھی طلبہ و سامعین سے خطاب کیا اور کہا کہ میں اس طرح کی بیشتر مجلسوں میں شریک ہوا ہوں لیکن جو مجلس مجھے یہاں ملی وہ بہت ہی کم جگہوں میں ملی ہے یہاں کے نوجوان اور باشعور طلبہ کی باتوں کو سن کر حوصلہ کافی بلند ہوا اور ان ہونہار طلبہ کے ابھرتے ہوئے رنگ کو دیکھنے کے بعد مجھے اقبال کا یہ شعر یاد آ رہا ہے

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی (شکریہ)

صفحہ ۴ سے آگے

شب کے تارے تجھ پر کرتے ہیں رشک کیا کیا
وہ شوخ چشم شہلا ہے جان جس پہ شیدا
انجم کو تاب کیا ہے ہوں اس کے ہم اشارا

(تہذیب الاخلاق یکم ربیع الثانی ۱۳۱۲ھ)

ان نظموں کی ہیئت و ماہیت، لہجہ کی نزاکت، اور جذبات کی شدت حالی، آزاد، اور شبلی کی نظموں سے مختلف ہے مجھے یقین ہے کہ تہذیب الاخلاق کے شماروں کا از سر نو مطالعہ اردو جاننے والوں کے لیے بہت مفید ہو گا۔ نئی معلومات فراہم ہوں گی۔ ان جواہر پاروں میں جدیدیت، معقولیت، روشن خیالی اور وسیع النظری کے مرقعے ملیں گے۔ جن سے ابھی تک بہت سے خواص و عوام روشناس نہیں ہیں اور وہ ہماری زندگی اور انسانیت کے لیے بہت کارآمد ہیں۔ کم سے کم سید محمود کے مضامین اور ان کے تراجم و اقوال ایک جلد میں جمع کر دیئے جائیں اور ان کی حیات و کردار پر ایک سیر حاصل مقالہ لکھ دیا جائے تو سید محمود کی ادبی عظمت کس حد تک آشکار ہو جائے اور ان کے مرتبہ کا تعین ہو جائے۔

انجمن ترقی اردو ہند کے لیے پرنٹر ظہیر الدین قریشی نے علم و حکمت پریس علی گڑھ میں چھپایا اور پبلشر نذیر حسین نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا